اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے ڈراموں میں فنی وفکری مماثلتیں

محمد سلمان بھٹی
امجد علی

Abstract:

The tradition of drama as a genre in Urdu literature is not very old. It originated almost two hundred years ago. Along with several playwrights, Ashfaq Ahmed and Bano Qudsia played a key role in the promotion and development of this genre. They wrote a good deal of plays for radio, stage and TV. As both dramatists lived together as husband and wife for a considerably long period of their lives, it was natural that there was mutual harmony between their temperaments, dispositions, and outlooks. This article gives a brief overview of common elements present in the plays of both playwrights.

پاکستانی اردو ڈراما کی ترویج وترقی میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔دونوں ڈراما نگاروں نے ریڈیو اور ٹی وی کے لئے کثیر تعداد میں معیاری اور یادگار ڈرامے تحریر کیے۔اشفاق احمد کے ڈرامائی مجموعوں میں توتا کہانی (ڈراما سیریز)،، ایک محبت سو ڈرامے (ڈراما سیریز)، قلعہ کہانی (ڈراما سیریز)، ننگے پاوں (ڈراما سیریز)،اور ڈرامے (ڈراما سیریز)، بند گلی (ڈراما سیریز) ،حیرت کدہ (ڈراما سیریز) ،ٹاہلی تھلے (ڈراما سیریز) ،اچے برج لہوردے (ڈراما سیریز) من چلے کا سودا (ڈراما سیریل) ،شاہلا کوٹ (ڈراما سیریل)،شہر آرزو (ڈراما سیریل) ،شامل ہیں۔

بانو قدسیہ کے ڈراموں کے مجموعوں میں آدھی بات (اسٹیج ڈرامے)،فٹ پاتھ کی گھاس (طویل دورانیے کے کھیل)،ضرب جمع تقسیم (ڈراما سیریل)،سورج مکھی (ڈراما سیریل)،میری ڈائری (ڈراما سیریز) ، نیا دور (ڈراما سیریز)،تماثیل (ڈراما سیریز) ،دوسرا قدم (ڈراما سیریز) ،ننی منی کہانیاں (بچوں کی ڈراما سیریز) ،شامل ہیں۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے شادی کے بعد زندگی کا طویل عرصہ اکٹھے گزارا۔اس لئے ان کی فکر اور طبعی میلانات میں ہم آہنگی فطری امر تھا۔دونوں ادبا نے ناول،افسانہ اور ڈراما تینوں اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن بہر

طور ڈراما نگاری دونوں کا امتیازی وصف ہے۔ بلاشبہ اشفاق احمد ایک بلند پایہ ادیب تھے لیکن اپنی ادبی حیثیت میں بانو قدسیہ کا قد کاٹھ بھی کسی طور ان سے کم نہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اشفاق احمد جیسی بارعب ادبی شخصیت کی چھایہ میں فکری پرورش پانے کے باوجود بانو قدسیہ نے اپنی شناخت کی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا۔ البتہ ممتاز مفتی صاحب کی یہ رائے الگ بحث کا تقاضا کرتی ہے کہ اشفاق احمد نے بانو قدسیہ کی اس انفرادیت کو سچے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا:

> ''اشفاق احمد نے بانو کی تخلیقی قوتوں کو سچے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ ادبی میدان میں بانو کی حیثیت اشفاق سے بلند تر ہے۔ اگر آپ بانو کی تخلیق کاری کے متعلق بات کریں تو کہیگا ہاں اچھا لکھتی ہے۔ لیکن یار بڑی مغز ماری کے اسے یہاں لایا ہوں۔ اب بھی میرے فقرے چارتی رہتی ہے۔''[۱]

انسانی زندگی کے نشیب وفراز اور وقت کا اتار چڑھاو انسانی افکار و خیالات کو ہمہ وقت ہانکتا رہتا ہے۔ اگر ایسا ہو بھی جیسا کہ ممتاز مفتی صاحب کی رائے ہے تو ضروری نہیں کہ اشفاق احمد کی بانو قدسیہ کے حوالے سے ایسی سوچ تمام عمر قائم رہی ہو۔ بڑا ادیب قدرت سے فراخ دل و دماغ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ کئی ایک انٹرویوز اور ادبی محفلوں میں اشفاق احمد کی بانو قدسیہ سے متعلق رائے ممتاز مفتی صاحب کیاس تجزیے سے قدرے مختلف رہی ہے۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی ایک ہی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان میں حد درجہ بے تکلفی بھی تھی ممکن ہے کہ اشفاق احمد نے یہ بات کسی وقت ازراہ تفنن کہی ہو۔ اس رائے کو کئی پہلوں سے جانچا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر بانو قدسیہ کسی نہ کسی طور اشفاق احمد سے متاثر تو رہیں لیکن اپنی ادبی شناخت پر بھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ بشریٰ رحمٰن بانو قدسیہ کی ڈراما نگاری سے متعلق لکھتی ہیں: ''ڈراموں میں ان کے لکھے ہوئے ڈائیلاگ زندگی کے بہت قریب ہوتے تھے۔ ہر ڈائیلاگ میں زندگی ایک فلسفہ بیان کرتی تھیں۔ ڈائیلاگ انہیں کہتے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں۔''[۲]

جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا ہے کہ بانو قدسیہ کی ادبی تربیت میں اشفاق احمد کا کلیدی کردار رہا ہے اور یہی نہیں بلکہ بانو قدسیہ نے بھی ہمیشہ فراخ دلی اور فخر سے اشفاق احمد کو اپنی کامیابیوں کی اہم وجہ گردانا ہے۔ اس بات کی تائید میں یہاں شاکر حسین شاکر کا ایک حوالہ نقل کرنا مناسب رہے گا:

> ''ایک بار کسی نے ان سے پوچھا بانو آپا آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ جواب بھی ان کی شخصیت کی طرح مختلف تھا۔ کہنے لگیں: میری کامیابی میں سب سے بڑا ہاتھ میرے شوہر کا ہے شروع شادی کے دن تھے داستان گو ہمارا رسالہ تھا۔ غریبی بھی پورے عروج پر تھی۔ انہوں نے مجھ سے فرضی ناموں سے کہانی لکھوانی شروع کر دی اور یوں میں کہانی لکھنے میں رواں ہوگئی۔ وہ گھر آ کر یہ نہیں

پوچھتے تھے کہ آج کیا پکایا ہے؟ ان کا سوال ہوتا تھا آج کتنے صفحات لکھے، کتنے گھنٹے لکھنے کو دیئے۔ انہوں نے یہ عادت اتنی پکی کر دی کہ پھر تو انہوں نے کبھی نہ بچوں کی خیریت دریافت کی نہ میری۔ بس مجھے لکھنے اور پڑھنے پر لگا دیا۔''۳

شاکر صاحب کے اس حوالے سے کسی حد تک اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اشفاق احمد نے بانو قدسیہ کی شخصیت پر ادبی لحاظ سے کس طرح اثرات مرتب کیے۔

قصہ یا کہانی اور پلاٹ یہ ایک ایسا فنی لازمہ ہے جس کے گرد ڈراما گھومتا ہے۔ ڈرامے کی کامیابی کا انحصار پلاٹ پر ہے اور قصہ پلاٹ کی ترتیب و تزئین میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ قصے کے واقعات میں ربط و تسلسل اور منطقی ہم آہنگی موجود ہونی چاہئے ورنہ ڈراما کی بنیاد مضبوط نہیں ہوگی اور بنیاد کی کمزوری عمارت کو کسی بھی وقت زمیں بوس کر سکتی ہے۔ کہانی پڑھنے اور لکھنے کی عادت نے بانو قدسیہ کو اس فن میں مشاق کر دیا تھا۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ دونوں نے اپنے ڈراموں کے پلاٹ پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے تحریر کردہ ڈراموں کے واقعات میں تسلسل اور منطقی ربط ہے جو ابتدا سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناظر یا قاری کی دلچسپی اور تجسس کم نہیں ہوتا بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے۔ کردار نگاری بھی ڈراما کے فنی عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے کرداروں کے ذریعے انسانی جذبات و احساسات کی حقیقی تصاویر پیش کی ہیں۔ دونوں ڈراما نگاروں نے اپنے ڈراموں میں زندہ و جاوید کردار تخلیق کیے۔ کردار نگاری میں مہارت بھی ان دونوں ڈراما نگاروں کا امتیاز ہے۔

دونوں ڈراما نگار ڈرامے کی کہانی، واقعات اور سماجی و ثقافتی ماحول کی مناسبت سے کرداروں کا انتخاب کر کے انہیں تراشتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی ڈرامے میں اعلیٰ طبقے کی کہانی پیش کی گئی ہے تو اس میں کرداروں کا رہن سہن، زبان، نشست و برخاست سبھی اسی طبقے کی نمائندگی کرتے دکھائی دیں گے۔ یہی خوبی دیہات اور شہروں میں پائے جانے والے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ، مہذب اور غیر مہذب، ظالم اور مظلوم، نیک اور بدغرض ہر نوع کے کرداروں میں دکھائی دے گی۔ بانو قدسیہ کے ایک کھیل مایا داس میں ایک رکشہ والے کی کہانی بیان کی گئی ہے اگر ناظر نے ایسے کردار کی زندگی اور نفسیات کو قریب سے مشاہدہ کیا ہو تو اسے بانو قدسیہ کے تخلیق کردہ کردار سے بالکل اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ بانو قدسیہ کے کرداروں کی یہ خوبی ہے کہ وہ حقیقی زندگی سے قریب تر ہیں۔ اشفاق احمد کی ڈراما سیریز ''سونا ملے نہ پی ملے'' میں دیہی معاشرے کی پیشکش ہے اور کردار بھی اسی مناسبت سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ''ڈرامے'' اور ''ٹاہلی تھلے''، ''ایک محبت سو ڈرامے'' بھی ایسی ہی خصوصیات سے مزین ہیں۔ غرض یہ کہ دونوں ڈراما نگاروں کے متعدد ڈرامے ایسے ہیں جو ایسی ہی مماثل خصوصیات سے مزین ہیں۔ کہانی، پلاٹ اور کردار کے علاوہ مکالمہ بھی ڈرامے کا بنیادی جز سمجھا جاتا ہے۔ پلاٹ کی صراحت و وضاحت اور کردار کی شخصیت کو سمجھنے میں یہ عنصر کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ مکالمے کردار کے اوصاف، خوبیوں اور الجھنوں کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے

کھیل کو کلائمکس تک پہنچاتے ہیں اور یہی کرداروں میں تصادم یا تضاد یعنی Conflict پیدا کرتے ہیں جو ڈرامے کی تحریک کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مکالموں کی کمزوری کردار کو انفرادی اور ڈرامے کو مجموعی طور پر کمزور کرتی ہے، اس لئے لازم ہے کہ مکالموں کی ساخت اور برتاو یعنی Structure and Treatment فطری ہو۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے اپنے ڈراموں میں مکالمہ نگاری پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ان کے کردار اپنی سماجی حیثیت کے عکاس ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے برتاو فطری رنگ لیے ہوئے ہے۔ البتہ اشفاق احمد کبھی کبھار تبلیغ کی غرض سے اپنے تخلیق کردہ کرداروں میں جبرا حلول کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اشفاق احمد کے ایسے کردار مثالی بن جاتے ہیں جو محض اخلاقیات کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے کرداروں کے سبھاو اور انداز تکلم میں بے ساختگی ہے جو کرداروں سے جڑی کئی شخصی خوبیوں اور خامیوں کو پیش کرتی ہے۔ بانو قدسیہ کی ڈراما سیریز مایا داس میں رکشہ ڈرائیور اور اس کی بیوی کے مابین ہونے والی گفتگو ملاحظہ کریں:

’’رشید کھول دے تھانیدارانی۔ دروازہ کھول دیچو نہیں ہے باہر۔

(بالی دروازہ کھولتی ہے۔ لیکن لالٹین بند کر دیتی ہے)

رشید: ہیں ہیں لالٹین کیوں بند کر دی

بالی: اس گھر میں سبھی کیوں جلیں۔ میں کافی نہیں ہوں کیا؟

رشید: (دوبارہ ماچس سے لالٹین جلاتا ہے) تمہارے جلیں دشمن

بالی: رکشا کہاں رکھا ہے تو نے آج۔

رشید: باہر کھڑا کر دیا ہے۔

بالی: اندر لے آتا۔

رشید: رکشا رات بھر چارپائی کے ساتھ کھڑا رہتا ہے تو نیند نہیں آتی۔

بالی: روٹی لاوں۔

رشید: نہیں کھالی تھی

بالی: کیا کھایا تھا

رشید: پکوڑے روٹی۔‘‘[۹]

اشفاق احمد کے تحریر کردہ کھیل ’’نیلی چڑیا‘‘ میں مریض اور ڈاکٹر کی گفتگو ملاحظہ کریں:

’’بابا: ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: (گھبراہٹ اور جھلاہٹ کے ساتھ) بابا جی خدا کے لئے معاف کرو۔
یہ خیراتی ہسپتال نہیں ہے۔موڑ پر چلے جائیکئی کلینک اور مل جائیں گے آپ کو۔جان
چھوڑیئے میری خدا کے لئے۔

بابا: ڈاکٹر صاحب میری پسلی میں بڑا درد ہوتا ہے جی۔

ڈاکٹر: دیکھو بابا جی اس کلینک پر جو بھی آتا ہے اسے کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہوتی ہے۔
ہمارے دل میں اب ہر تکلیف کو دیکھ کر درد نہیں ہوتا۔معاف کیجئے اور جائیے۔
وقت نہ ضائع کیجئے میرا (آواز دے کر) منصور! پنسلین کا ایک ٹیکہ لگا دو نور بانو کو۔
جاو بابا جی جاو۔

بابا: ڈاکٹر صاحب نوکری میری چھوٹ گئی۔صحت میری نہ رہی میں دو روپے فی ٹیکہ
دینے جوگا نہیں۔

ڈاکٹر: اگر میں ہر مریض پر ترس کھانے الگوں تو بھوکوں مرجاوں جاو بابا جی۔
ہمارا مغز نہ کھاو خدا کے لئے (بابا لمبی سے آہ بھر کر جاتا ہے)

بابا: کل دس روپے تو میں لایا تھا ڈاکٹر صاحب مانگ کر۔''[۵]

دونوں ڈراما نگاروں کے پیش کردہ کھیلوں کے مکالموں سے ان کے تخلیق کردہ کرداروں کی سماجی زندگی، معاشی پسماندگی، احساس کمتری اور نفسیات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ با اعتبار موضوع اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے ڈراموں میں ایک مماثلت مزاح بھی ہے۔ان کے ڈراموں میں زندگی سے بھر پور کردار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے ایک کھیل دلبر کی قیمت میں یہ کیفیت ملاحظہ کیجیے:

''لبرٹی: گولی چلائیں سردار؟

دلبر: اس طرح گولی چلاوگے احمقوں تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔

منشی: چالاک بننے کی کوشش نہ کیا کرو۔ہم کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔ہم نامی گرامی ڈاکو ہیں۔

دلبر: کب سے یہ کام شروع کیا ہے؟

فرینڈلی: کب سے (مزید ہنس کر) یہ کام ہم نے کب سے شروع کیا ہے؟

قہر جان: یہ ہمارا جدی پشتی پیشہ ہے دلبر شفیق صاحب۔کئی پیڑھیاں گزر گئیں اس کاروبار میں۔
ہم کوئی عطائی لوگ نہیں ہیں۔

منشی: سن او بدنصیب۔مرگ قریب ہے۔یہ نوجوان سا ندل باری گھرانے کا ڈاکو ہے۔نا نکے

دادکے دونوں گھرانے اپنے وقت کے نامی گرامی ڈاکو تھے۔ستائیس بندے اس کے
نانکوں نے اس کے دادکوں کے مارے۔دوکم چالیس بندے اس کے دادکوں نے اس
کی والدہ کے خاندان کے مارے۔

قہر جان: میرا تایا بتایا کرتا تھا کہ جب ہم اپنے اپنے دشمنوں کی لاشیں اپر باری دوآب میں بہانے
کے لئے جاتے تھے تو ایس ڈی اونہر، اوورسیئز اور پن سال نویس ہم کو بینتیں مار مار کر
ہماری چمڑی ادھیڑ دیتے تھے۔

دلبر: کیوں

ڈاکو اوئے موگھے بند ہو جاتے تھے۔کھیتوں کو پانی نہیں ملتا تھا۔
فصلیں خراب ہو جاتی تھیں۔ایس ڈی او نے تو پھینٹی چاہڑنی ہی تھی۔''۶

اب اسی طرح مزاح کی ایک کیفیت اشفاق احمد کے کھیل ہیرا من میں ملاحظہ کریں:

''سلمان: میری ماں چاہتی تھی کہ میں کوئی بڑا افسر بنتا۔

راشد: ماں ہر ایک آدمی کی تھوڑی تھوڑی پاگل ہوا کرتی ہے اگر ماں کی آنکھوں پر پٹی نہ بندھی
ہوا کرے تو آدھی مائیں تو اپنے بچے چھوڑ کر بھاگ جائیں۔

جاوید: جلدی جلدی کرو۔گیارہ بج گئے ہیں میری ڈیوٹی کا ریکارڈ خراب ہوتا ہے۔لنچ وقت
پر ملنا چاہئے۔

سلمان: خود تو چولہے میں ماچسیں دکھاتے ہو اور مشکل کام سارا مجھ کو کرنا پڑتا ہے۔
(آرام سے دیگچی چولہے پر رکھتا ہے اور اپنے مکالمے کے بعد زانو کے گرد کنگھی ڈال کر
سوچ میں مگن ہو جاتا ہے)

جاوید: پیاز کاٹنی مشکل کام ہے؟ آٹا گوندھنا مشکل کام ہے؟ یار ہماری قوم کا کیا بنے گا۔اتنے
چھوٹے کام تو ہم سے ہوتے نہیں۔ہم کب ہوائی جہاز بنائیں گے۔کب ہمارا راکٹ
چاند پر پہنچے گا۔کب ہم تیل دریافت کریں گے۔جلدی پیاز لاؤ دیگچی لال ہو رہی ہے۔

راشد: کاش ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کوئی ملازم مل جاتا تو میں بڑے بڑے
کاموں کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتا۔''۷

دونوں ڈراما نگاروں کے ہاں مزاح کی ہلکی اور خفیف، نرم وگداز تہیں موجود ہیں جن میں چبھن کا کہیں احساس نہیں۔دونوں کے ہاں جس طرح مکالموں، کرداروں اور مزاح میں مماثلت موجود ہے۔اسی طرح ان کے ہاں

جذباتی کیفیات کی پیشکش میں بھی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ان میں ایک جذبہ "رحم" بھی ہے۔اشفاق احمد کیا یک ریڈیائی ڈرامے سبکتگین اور ہرنی میں ایک کردار سلطان ہرن کا بچہ پکڑ لیتا لیکن پھر وہ اس بچے کی ماں پر رحم کھاتے ہوئے اس کے بچے کو چھوڑ دیتا ہے حالانکہ اسے بادشاہ سے انعام واکرام ملنے کی بھی امید تھی، لیکن پھر بھی جذبہ رحم غالب آتا ہے۔

سلطان: لیکن آہستہ آہستہ کیوں چل رہی ہے ہرن کا کام تو چوکڑیاں بھرنا ہوتا ہے اور یہ نڈھال سی چل رہی ہے۔

داود: شائد بیمار ہو۔

سلطان: مجھے تو یوں نہیں لگتا۔

داود: آپ کمند تو پھینکیں۔ارشاد ہو تو میں پھینکوں............

سلطان: ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو داود۔اگر تمہارا ایک بچہ ہوتا اور کوئی ظالم اسے باندھ کر گھوڑے پر لاد کر لے جاتا تو تمہارے دل پر کیا گزرتی؟

داود: لیکن یہ تو جانور ہے استاد۔اسے ان باتوں کی کیا خبر۔

سلطان: جانور بھی ہماری طرح ایک جیتی جاگتی چیز ہے اسے بھی دکھ سکھ کی خبر ہے۔یہ بھی اپنے بچوں سے ہماری طرح پیار کرتا ہے۔مجھ سے برداشت نہیں ہوتا داود۔دیکھو تو ہماری بے چاری ہرن کس طرح لڑکھڑا کر چل رہی ہے۔ذرا بچے کو سہارا دینا۔

داود: آپ کیا کرنے لگے ہیں استاد۔

سلطان: اسے سہارا دینا۔میں شکار بند کھول کر اس بچے کو آزاد کر دینا چاہتا ہوں۔جب یہ چھلانگیں مارے گا چوکڑیاں بھرتا اپنی ماں کے پاس پہنچے گا تو ہرنی کو دنیا جہاں کی دولت مل جائے گی میں ہرنی کی اس خوشی پر سارے انعام عزت و دولت مرتبہ قربان کر دینا چاہتا ہوں۔'' ۸

یہی رحم کا جذبہ بانو قدسیہ کے ایک کھیل ''تحفظ'' کے کردار عارف میں بھی انگڑائی لیتا ہے کہ وہ فٹ پاتھ پر پڑی ایک اماں جی کو اٹھا کر گھر لے آتا ہے۔حالانکہ اسے لانے میں عارف کو دیر ہو جاتی ہے اور اس نے اپنی بیوی کو چھوڑنے ائیر پورٹ بھی جانا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اماں جی کو گھر لاتا ہے، اپنے ساتھ رکھتا ہے، کھانا کھلاتا ہے اور اس کا علاج بھی کرواتا ہے:

''رومانہ: لیکن وہ آپ کو ملی کہاں سے؟

عارف: اوہو۔میں اسے کوئی بائی اپوائمنٹ لے کر ملا ہوں۔مل گئی فٹ پاتھ پہ گری ہوئی بخار میں تپ رہی تھی بیچاری۔''۹

انسانی جذبات میں سے ایک جذبہ حسد بھی ہے۔آج کا مشینی انسان اس کا آسان شکار ہے۔اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے اس جذبے کو بھی اپنے ڈراموں میں بڑے نپے تلے انداز میں پیش کیا ہے۔بانو قدسیہ کے ایک کھیل اک تیری وجہ سے کا ایک کردار انکل رفعت اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کو اپنے گھر لے آتا ہے۔اس عمل پر انکل رفعت کا حقیقی بیٹا ٹیپو اس بات سے ناراض ہو جاتا ہے کیونکہ انکل رفعت اپنے دوست کے بیٹے (نثار) کو بھی اپنے سگے بیٹے کی طرح ہی سمجھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ٹیپو میں اپنے باپ کے اس عمل کی وجہ سے جذبہ حسد بیدار ہوتا ہے۔ٹیپو کے مکالموں سے اس کا جذبہ حسد بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے:

''ٹیپو: یہ ابو کی زیادتی ہے اماں۔وہ اپنی دوستی نبھائیں لیکن نثار کو میرے سر تو نہ تھوپیں۔

خالہ: ساری عمر انہوں نے بھائی شیر زماں خاں کو سگے بھائیوں سے زیادہ چاہا ہے۔

ٹیپو: یہی تو مصیبت ہے ابو کی۔ان کی پرائے اور ٹیز درست نہیں ہیں۔

خالہ: کیا مطلب ہے تیرا؟

ٹیپو: انہیں معلوم نہیں مقدم کون ہے اور موخر کون؟انہیں بھائی اور دوست کا فرق معلوم نہیں۔دوست کے بیٹے اور سگے بیٹے کی اہمیت کا علم نہیں۔

خالہ: پھر؟

ٹیپو: جب وہ گھنٹوں نثار کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔اسے خاندانی بندوق استعمال کرنے کو دیتے ہیں،اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں تو میں برداشت نہیں کر سکتا......میرا لہو کھولنے لگتا ہے۔''۱۰

اشفاق احمد کا ایک کھیل ''پیغام زبانی اور ہے''میں ایک کردار نصیر ہے جو کہ سیٹھ یوسف کا پرانا ملازم ہے۔سیٹھ کی اپنی کوئی اولاد نہیں اس لئے وہ ہمسایوں کے بچوں سے بہت محبت کرتا ہے اور ان کے ناز نخرے اٹھاتا ہے،لیکن اس کیملا زم نصیر کو یہ سب ناگوار گزرتا ہے اور وہ ان بچوں سے حسد رکھتا ہے۔ایک دن سیٹھ کی غیر موجودگی میں ہمسائیوں کے بچے اسے ملنے آتے ہیں تو نصیر انہیں حقارت اور نفرت سے واپس بھجوا دیتا ہے۔لیکن راستے ہی میں جب سیٹھ کی بچوں سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ انہیں واپس گھر لے آتا ہے۔ذیل کے مکالموں میں نصیر کا حسد نمایاں ہے:

''یوسف: میں گھر پر نہیں تھا تو تم لوگ انتظار کر لیتے میرا۔

نصیر: سلام علیکم سر جی۔یہ لوگ رکتے ہی نہیں تھے میں نے تو کہا بھی ٹیپ ریکارڈ لگا دیتا ہوں۔

نونی: (ایک چھوٹی بچی) کب کہا تھا تم نے؟

نصیر: کہا نہیں تھا جب تم صومی سے ٹافی چھین رہی تھی۔

ارشاد: یہ جھوٹ بولتا ہے انکل۔

یوسف: اپنے سے بڑے کو اس طرح نہیں کہا کرتے ارشاد بیٹا۔

نصیر: (جھوٹ موٹ روتے ہوئے) دیکھ لیجئے جی ان کی میں کیسی کیسی خدمتیں کرتا ہوں پورا دو پونڈ کا تو یہ جیم کھا گئے۔Honey کی بوتل ختم کر دی Flabe Corn سارے ہضم کر گئے۔ساتھ ہی آپ کی نظروں میں چور ہوں۔ساتھ یہ مجھے جھوٹا کہیں۔

یوسف: (جیب سے ایک پلاسٹک کا غبارہ نکالتا ہے) ناں بھئی۔نصیر بھائی تو اپنا آدمی ہے پرانا۔ اسے کچھ نہیں کہتے۔یہ دیکھو ہم کیا لائے ہیں سب کے لئے۔

نونی: میرے لئے پنسلوں کا ڈبہ نہیں لائے انکل۔

یوسف: (نکال کر دیتا ہے) لائے ہیں لائے کیوں نہیں۔(جس وقت یوسف سب کو چیزیں دیتا ہے نصیر بیزاری کے عالم میں حسد کے ساتھ سبز ہوا جاتا ہے)''[۱۱]

دونوں ڈراما نگاروں کے کھیلوں کی ایک اہم اور مشترک صفت تصوف بھی ہے۔دونوں شخصیات کے ہاں باطن کی یہ کیفیت ان کے کئی کھیلوں میں نمایاں خدوخال لیے جلوہ گر ہوتی ہے۔دونوں ڈراما نگاروں کی تحریروں میں تصوف زندگی کی مجسم صورت لیے ہوئے ہے۔دونوں کے ہاں انصاف، محبت، حسد، نفرت، علم دوستی، فقر، درویشی غرض خیر وشر کی کیفیات کئی جگہوں پر تصوف کے پردوں سے عیاں ہوتی، کھلتی، لپٹتی دکھائی دیتی ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے نزدیک تصوف کی دوا سے خصوصاً نوجوان نسل کی روحانی تربیت مقصود ہے۔اشفاق احمد کے مجموعے''من''گے پاوں'' کے ایک کھیل''ڈھور ڈنگر'' میں بابا جی علم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے مطابق علم ہی سے اللہ کی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔اشفاق احمد اپنے خیال وافکار کو بابا جی کے ذریعے یوں ادا کرواتے ہیں:

''بابا: کل علم والوں نے یہی لکھا ہے صاحب اپنی کتابوں میں کہ ان پڑھ بندا خدا کو بھی نہیں جان سکتا۔(ایک دم رو کر) خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔کوئی زندگی ہے صاحب ہمارے جیسے جانوروں کی۔ڈنگروں کی (سسکیاں بھر کر رونے لگتا ہے)''[۱۲]

صوفیا کے نزدیک انسان کی اپنی ذات اور حقیقت آدم سے آگہی بھی ضروری ہے۔اشفاق احمد کے ایک اور مجموعے''بند گلی'' کے ڈرامے''ناتے دار'' کا ایک کردار''عزیز'' یوں گویا ہوتا ہے:

''انسان بھی درخت کی طرح ہوتا ہے نبیلہ جان......درخت کی نازک ترین شاخ پر لگا ہوا آخری زرد رومخملی پتا بھی اپنی جڑوں کو جانتا ہے......کوئی اپنی گراس روٹس سے چاہے کتنی ہی بھاگ جائے ،اسے اپنی اصلیت پہچاننے میں دقت نہیں آتی۔نیگرو چاہے امریکہ میں بسے چاہے جاپان میں رہے ،جب اپنا ہم شکل دیکھے گا اسے افریقہ طاس ضرور یاد آئے گا۔''۱۳

اشفاق احمد کی طرح تصوف بانو قدسیہ کی بھی بیشتر تحریروں کا بنیادی حوالہ ہے۔سیریز ''دوسرا قدم'' کے کھیل ''کچا راستہ'' کے ایک کردار کی گفتگو ملاحظہ کریں:

''نذیر: سرجی......ایک بات......

ہادی: ہاں بتاؤ؟

نذیر: میں تو کچھ نہیں جانتا پر میرا باپ امام تھا مسجد میں۔

ہادی: مسجد کا امام تھا؟

نذیر: جی سرکار......چھوٹا سا گاؤں تھا۔تھوڑے سے لوگ تھے۔وہ کہا کرتا تھا احمقوں کمرے میں سے کاٹھ کباڑ نکال کر ہی سفیدی کرتے ہیں۔تم جانے دل میں کیا کچھ بسائے رکھتے ہو۔خالی کرو تو اللہ کے نام کی سفیدی ہو۔دنیا کے محبوب کے لئے کتنا کچھ نکال پھینکتے ہو۔''۱۴

مخلوق کی خدمت کے لیے رب سے جڑے رہنا بہت ضروری ہے وہی سے خدمت کی توفیق عطا ہوتی ہے۔رب سے لو اور اس کی عبادت دلوں کو نرم اور گداز رکھتی ہے۔بانو قدسیہ نے اپنی تحریروں میں اس کیفیت کو بڑی خوبی سے Dramatize کیا ہے۔اللہ والے صبح سویرے بیدار ہونے کے عادی ہوتے ہیں۔پیا نام کا دیا ڈراما سیریز میں باپ اپنی بیٹی کو نصیحت کرتا ہے کہ

''ہمارے استاد مستور خاں اللہ انہیں غریق رحمت کرے......بڑے بھولے آدمی تھے......ہمیشہ صبح کے وقت ریاضت کرتے تھے۔کہا کرتے تھے......بے وقوف! صبح کے ریاض میں اللہ کا نور بھی شامل ہوتا رہتا ہے۔پرندوں کی آوازیں بھی ہوتی ہیں تو نے صبح کیوں اٹھنا چھوڑ دیا ستارہ۔''۱۵

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے زندگی کا ایک طویل عرصہ بطور میاں بیوی ایک ساتھ گزار۔بانو قدسیہ نے جب اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تو انھوں نے اشفاق احمد ہی کو اپنا استاد تسلیم کیا۔اشفاق احمد کی سحر انگیز شخصیت اور ان کی تحریروں نے بانو قدسیہ پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔اشفاق احمد نے ڈرامے کے جن ذرائع کے لیے کھیل تحریر کیے ان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن شامل ہیں جبکہ بانو قدسیہ نے ریڈیو،تھیٹر اور ٹیلی ویژن ان تین ذرائع کے لیے کھیل

تحریر کیے۔ البتہ دونوں ڈراما نگاروں نے فلم کی جانب توجہ صرف نہیں کی۔ میرے نزدیک اس کی وجہ شاید وہ تبلیغ اور کردار سازی تھی جو دونوں ادبا کا مطمع نظر تھی اور یہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے زیادہ بہتر انداز سے کی جاسکتی تھی، جبکہ فلم کا Medium اپنے بازاری اور خالصتاً Commercial تناظر میں تبلیغ و تربیت اور کردار سازی جیسے بار کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ بانو قدسیہ نے تھئیٹر کے لیے جو کھیل تحریر کیے وہ اس لیے اور بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے تمام کھیل طبع زاد ہیں۔ بانو قدسیہ نے یہ کھیل ایسے دور میں تخلیق کیے جب تھئیٹر کے لیے تراجم پر زور صرف کیا جاتا تھا اور تھئیٹر ڈرامے کی کامیابی محض ترجمہ شدہ ڈراموں سے منسوب تھی۔ البتہ اشفاق احمد نے تھیٹر کے لیے کوئی کھیل تحریر نہیں کیا۔ جہاں تک دونوں ڈراما نگاروں کے مماثل موضوعات کا تعلق ہے تو دونوں نے اپنے ناظرین و سامعین اور قارئین کو گوں نا گوں موضوعات سے متعارف کروایا۔ یوں تو بانو قدسیہ اپنی تحریروں میں منفرد طرز کی حامل ادیبہ ہیں لیکن اس کے باوجود بھی کبھی کبھار وہ اشفاق احمد کے مشاہدے کا محدب عدسہ مستعار لے کر اس سے معاشرے کا جائزہ لیتی اور مشاہدہ کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بانو قدسیہ نے زیادہ تر ایسے معاشرتی مسائل و معاملات کو موضوع بنایا جنھیں اشفاق احمد نے چنا۔ دونوں ڈراما نگاروں کے کھیلوں میں معاف کرنا، تصوف، رومانیت، مابعد الطبیعات، عزت نفس کی پامالی، وقت کی جبر بیت، والدین کی نافرمانی، متوسط طبقے کی محرومی، احساسِ کمتری، مادہ پرستی، ریاکاری، منافقت، لالچ، حسد، خود غرضی، بغض، رشوت، سفارش، تنہائی، حسی تاثرات، میاں بیوی کی چپقلش، اخلاقی گراوٹ، دین و مذہب سے دوری، جھوٹی نمود و نمائش، دقیانوسی سوچ، حب الوطنی، تعلیمی فقدان اور مغربی کلچر کے اثرات وغیرہ جیسے کئی مماثل موضوعات موجود ہیں۔

دونوں ڈراما نگاروں کے کھیلوں میں پلاٹ کی سادگی ان کے فن کو جلا بخشتی ہے۔ دونوں ڈراما نویس کرداروں کے جنگل تخلیق نہیں کرتے، ان کے ڈراموں میں غیر ضروری کردار دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے ڈرامے کا ہر کردار اپنے دائرہ حیات میں انفرادی وکلی حیثیت کا حامل ہے۔ دونوں کے کردار متحرک ہیں، زندگی سے نبرد آزما، جیتے جاگتے۔ ان کرداروں کی اہم خوبی ان کی زبان ہے، جو ان کی نفسیات کی عکاس ہے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار خواہ وہ نچلے طبقے سے ہوں یا اعلیٰ طبقے سے مثبت ہوں یا منفی، بہترین چنیدہ کردار ہیں۔ دونوں کی ایک اور مشترک خوبی بگڑے کرداروں کی تربیت اور ان میں مثبت تبدیلی کے آثار ہویدا کرنا بھی ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے اپنے ڈراموں میں لسانی ہیئت کے بھی کئی تجربات کیے ہیں۔ جزئیات نگاری کی مہارت، منظر کشی کا ملکہ اور فلیش بیک تکنیک کا استعمال ان کے ڈراموں کو مزید موثر و پختہ بناتا ہے جس سے دونوں کے مطمع نظر کی ترویج میں معاونت ہوتی ہے۔ دونوں کے ڈرامے ناظر و سامع کو مثبت تحریک عطا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نادر تشبیہات اور صنعتِ تکرار کو بھی ایسی مہارت سے برتا گیا ہے کہ قارئین کے لیے بھی ان کے تحریر کردہ ڈراموں کا اسلوب ایک جاندار اور صوری (Visual) حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

حواشی:

۱۔ محمد شاہد (مرتب)، بے نیاز صوفی بابا، از اشفاق احمد (لاہور: علم دوست پبلی کیشنز: س ن) ص ۱۷

۲۔ بشریٰ رحمٰن ، مرقع مہرو۔۔وفا۔۔بانو قدسیہ، مشمولہ: سہ ماہی، نوائے ادب انٹرنیشنل، لاہور، اپریل تا جون ۲۰۱۷ء، ص ۱۸

۳۔ عامر رحمٰن محمود، رانا (مرتب)، بانو قدسیہ ایک عہد ایک دبستان، (لاہور: قلم فاونڈیشن انٹرنیشنل،) ص ۹۲

۴۔ بانو قدسیہ، دوسرا قدم، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص ۵۴۔۳۵۳

۵۔ اشفاق احمد، حیرت کدہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء) ص ۱۷۶

۶۔ بانو قدسیہ، دوسرا قدم، ص ۵۰۔۲۴۹

۷۔ اشفاق احمد، حیرت کدہ، ص ۲۵۴

۸۔ سلامت صادق (مرتب)، اشفاق احمد کے چند ریڈیائی ڈرامے، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء) ص ۳۵۔۳۴

۹۔ بانو قدسیہ، دوسرا قدم، ص ۴۰۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹۔۳۲۸

۱۱۔ اشفاق احمد، حیرت کدہ، ص ۱۳۵۔۱۳۴

۱۲۔ اشفاق احمد، ننگے پاوں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء) ص ۴۷۹

۱۳۔ اشفاق احمد، بند گلی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) ص ۵۷

۱۴۔ بانو قدسیہ، دوسرا قدم، ص ۵۱

۱۵۔ بانو قدسیہ، پیا نام کا دیا، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء) ص ۳۷